تدبرِ قرآن

۵۳

النّجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الطور ——— کی توام سورہ ہے۔ مرکزی مضمون دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی جزا اور سزا کا اثبات۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں عذاب کے پہلو کو نمایاں فرمایا ہے اور اس میں اس شفاعتِ باطل کی تردید ہے جس میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس عقیدۂ باطل کے باقی رہتے ہوئے مشرکین کے لیے بڑے سے بڑے عذاب کی دھمکی بھی بالکل بے اثر تھی۔ قرآن نے اسی وجہ سے قیامت اور توحید دونوں کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ کیا ہے تاکہ مشرکین کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ہے، اس سورہ میں اس اشارہ کی پوری وضاحت ہو گئی ہے۔ گویا ان دونوں سورتوں کا مشترک مضمون یہ ہے کہ منکرین و مکذّبین کے لیے اللہ کا عذاب لازمی ہے، اپنے جن معبودوں کی شفاعت پر یہ تکیہ کیے بیٹھے ہیں اول تو ان کی کوئی حقیقت نہیں، محض فرضی نام ہیں جو انھوں نے رکھ چھوڑے ہیں اور اگر کچھ حقیقت ہے تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ لوگوں کے ساتھ کامل علم اور کامل عدل پر مبنی ہو گا۔ اس بات کا وہاں کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی کی شفاعت اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے، یا اس کے فیصلہ کو تبدیل کر سکے یا باطل کو حق بنا سکے۔

عمود اور مضمون کے علاوہ سابق سورہ کے خاتمہ اور اس سورہ کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالیے تو دونوں میں بڑی واضح مناسبت نظر آئے گی۔ سورۂ طور کی آخری آیت 'وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ' ہے اور اس سورہ کی پہلی آیت 'وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی' ہے۔ گویا سابق سورہ کی آخری اور اس سورہ کی پہلی آیت نے دونوں میں ایک نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی شکل پیدا کر دی ہے۔ اس قسم کا اتصال اکثر مقامات میں موجود ہے۔ بعض جگہ لفظی، بعض جگہ معنوی، اور بعض مقامات میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کا۔ اس قسم کی بعض چیزوں کی طرف ہم نے پچھلی سورتوں میں اشارے کیے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۸) اس امر کا بیان کہ یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کوئی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ترین اور معتمد ترین فرشتہ کے ذریعہ سے اپنے پیغمبر پر یہ وحی فرمایا ہے۔

اس میں کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، بلکہ اس کی ہر بات مبنی بر حقیقت اور اٹل ہے۔ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ وحی اور جبریلؑ سے متعلق پیغمبرؐ اپنے جو مشاہدات و تجربات تمہارے ساتھ پیش کر رہے ہیں وہ کسی خیال آرائی یا فریبِ نظر پر مبنی ہیں۔ یہ سرتاسر حقیقت ہیں۔ پیغمبرؐ اپنے مشاہدات تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں۔ ان مشاہدات کے باب میں ان سے لڑنے کے بجائے تمہاری سلامتی ان کی دعوت پر ایمان لانے میں ہے۔

(۱۹-۲۸) مشرکین کو یہ تنبیہ کہ تمہارے یہ خیالی اصنام، جن کے بل پر تم قرآن کے انذار سے بے پروا ہو، بالکل بے حقیقت ہیں۔ نہ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل اتاری اور نہ تمہاری عقل و فطرت ہی کے اندر ان کے لیے کوئی جگہ ہے۔ یہ محض فرضی نام ہیں جو تم نے اپنے جی سے رکھ چھوڑے ہیں۔ حقیقت سے ان کو کوئی تعلق نہیں اور مفروضات حقیقت کے مقابل میں کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے، بالخصوص جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام کر دینے کے لیے تمہارے پاس اس کی نہایت واضح ہدایت بھی آ چکی ہے۔ یاد رکھو کہ تم نے جھوٹی آرزوؤں کے جو خیالی محل تعمیر کر رکھے ہیں یہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ انسان کو سابقہ اپنی تمناؤں سے نہیں بلکہ حقائق سے پیش آئے گا تو حقائق کے مواجہ کے لیے تیاری کرو۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ ان میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔ آسمانوں میں بے شمار فرشتے ہیں لیکن ان کی سفارش ذرا بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی، اللہ ہی جس کو چاہے گا اور جس کے لیے چاہے گا سفارش کی اجازت دے گا۔ آخرت کی مسئولیت اور قانونِ مکافات سے گریز کے لیے تم نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی شفاعت کی جو آڑ لی ہے یہ محض تمہاری خیالی پناہ گاہ ہے۔ یہ چیز ذرا بھی کام آنے والی نہیں ہے۔

(۲۹-۳۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ان سرگشتگانِ دنیا کو، جو اللہ کی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں، ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ آخرت سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اللہ نیکوں اور بدوں دونوں سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے کے رہے گا۔ آسمانوں اور زمین کا بلا شرکتِ غیرے مالک اللہ ہی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بروں کو اس کی پکڑ سے بچا سکے یا نیکوں کو ان کی نیکی کے صلہ سے محروم کر سکے۔ خدا کے ہاں اچھے صلہ کا حق دار ہر مدعی نہیں ہوگا بلکہ وہی ہوں گے جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے اجتناب کرتے رہے۔ یہ لوگ بے شک اس کی رحمت کے حق دار ہوں گے۔ اگر کبھی ان کے پاؤں کسی برائی پر پڑ گئے تو اللہ کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے گا۔ رہے وہ بر خود غلط جنھوں نے اپنے حسب و نسب اور اپنے خیالی معبودوں کی سفارش کے بل پر اپنے لیے خدا کے ہاں اونچے اونچے مراتب محفوظ کر رکھے ہیں، وہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھائیں۔ اللہ ان کی پیدائش کے تمام مراحل اور ان کے سارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

(۳۳-۵۵) ایک تحقیر آمیز اشارہ ان لوگوں کی طرف جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے یا کسی قربانی کا حوصلہ تو ذرا بھی نہیں رکھتے لیکن اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر نبیوں

کے نام لیوا اور ان کی ذرّیت میں ہیں اس وجہ سے خدا کی جنت کے پیدائشی حق دار ہیں۔ ان کو ان جلیل القدر نبیوں کی تعلیمات اور ان کی عظیم قربانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مرتبے ان کو گھر بیٹھے بٹھائے محض نسب و نماندان کی بنا پر نہیں مل گئے بلکہ ان کی ان بے مثال قربانیوں کی بنا پر ملے جو انھوں نے اللہ کی راہ میں پیش کیں۔ اللہ کے ہاں ہر ایک کا اپنا عمل تولا جائے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ عمل تو کسی نے کیا اور اس کا صلہ کسی اور کو ملے۔

اسی ضمن میں یہ حقیقت بھی نہایت زوردار الفاظ میں واضح فرما دی گئی ہے کہ رنج و راحت، موت و زندگی، بیٹا اور بیٹی، دولت و ثروت سب خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس وجہ سے ہر حال میں خدا ہی سے وابستہ رہنا چاہیے۔ جو قومیں دنیا میں پھنس کر خدا سے بے پروا ہو جاتی ہیں وہ اپنی تمام دولت و شوکت کے باوجود اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوتی ہیں جس طرح کے انجام سے عاد و ثمود اور ماضی کی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ ان قوموں کے آثار تمھارے گرد و پیش میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔

(۵۶-۶۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون، یعنی قرآن کی عظمت کی یاددہانی ہے کہ یہ کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اسی طرح کا ایک نذیر ہے جس طرح کے نذیر اس سے پہلے آچکے ہیں۔ اب تمھارے فیصلہ کی گھڑی سر پر آچکی ہے اور یہ تم کو اسی سے بروقت متنبہ کرنے کو نازل ہوا ہے۔ اگر تم متنبہ نہ ہوئے تو یاد رکھو کہ خدا کی پکڑ سے تم کو کوئی بھی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ جس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے اس پر تعجب نہ کرو، بلکہ اپنی اصلاح کرو۔ تم اس پر ہنستے ہو حالانکہ یہ ہنسنے کی چیز نہیں بلکہ تمھارے لیے رونے کی چیز ہے۔ اپنے غفلت کے بستر لپیٹو اور اپنے رب کے آگے سجدہ اور اس کی بندگی کرو۔

سُورَةُ النَّجْم (۵۳)

مَکِّیَّۃٌ —— آیات : ۶۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱-۱۸

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾ ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ وَہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ۚ﴿۹﴾ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ؕ﴿۱۰﴾ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ۙ﴿۱۳﴾ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۱۴﴾ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ؕ﴿۱۵﴾ اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۸

شاہد ہیں ستارے جب کہ وہ گرتے ہیں کہ تمھارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ گمراہ ہوا ہے، اور وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اس کو ایک مضبوط قوتوں والے، عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔ وہ نمودار ہوا، اور وہ افق اعلیٰ

یں تھا، پھر قریب ہوگیا اور جھک پڑا، پس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اس نے دیکھا یہ دل کی خیال آرائی نہیں ہے تو کیا تم اس سے اس چیز پر جھگڑتے ہو جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے! ۱-۱۲

اور اس نے ایک بار اس کو اور بھی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا، اسی کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ جب کہ چھائے ہوئے تھی سدرہ کو جو چیز چھائے ہوئے تھی۔ نہ نگاہ کج ہوئی اور نہ بے قابو۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ ۱۳-۱۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۱)

'النجم' سے مراد

'النجم' سے عام طور پر مفسرین نے ثریا کو مراد لیا ہے، لیکن اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ واضح قرینہ تو شعریٰ کا ہو سکتا ہے جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیا ہے لیکن اس کو مراد لینے کا بھی، جیسا کہ وضاحت آئے گی، یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اسم جنس کے مفہوم میں ہے جس طرح وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل: ۱۶) (اور تاروں سے وہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں) یا وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (الرحمٰن: ۶) (اور تارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں) اور اس نوع کی دوسری آیات میں جگہ جگہ قرآن میں آیا ہے۔

هَوٰى يَهْوِىْ کا مفہوم

'هَوٰى يهوى' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے گرنے کے ہیں، یہ لفظ تاروں کے افق سے غائب ہونے اور ڈوبنے کی تعبیر کے لیے بھی موزوں ہے اور اس آتش باری کے لیے بھی موزوں ہے جو غیب کی ٹوہ لگانے والے شیاطین پر تاروں سے ہوتی ہے اور جس کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

'وَالنَّجْمِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور قسم سے متعلق ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں یہ بیشتر شہادت کے لیے آئی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۲-۴)

[illegible]

یہ پوری بات مقسم علیہ کی حیثیت رکھتی ہے یعنی تاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب

کرکے فرمایا کہ تمھارے ساتھی (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو بھٹکے ہیں نہ گمراہ ہوئے ہیں۔ جو کلام وہ تمھیں سنا رہے ہیں اپنے جی سے گھڑ کے نہیں سنا رہے ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو تمھیں سنائیں تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

موقع کلام دلیل ہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کا جو الزام لگاتے تھے یہ اس کی تردید ہے۔ قریش کے لیڈروں کو جب آپ قرآن سناتے اور وحی اور اس کے لانے والے فرشتہ سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات بیان فرماتے تو وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے کہ یہ بھی ہمارے کاہنوں اور منجّموں کے قسم کے ایک کاہن و منجّم ہیں۔ جس طرح ستاروں کے قِرآن، نکھتروں کے مشاہدات اور جنّات کے القاء کی مدد سے وہ مسجّع و مقفّی کلام پیش کرتے اور غیب کی باتیں بتلاتے ہیں اسی طرح یہ بھی مسجّع کلام سناتے اور مستقبل کی باتیں جاننے کے مدّعی ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے محض ڈھونس ہے۔ جس طرح ہمارے کاہنوں پر جنّات القاء کرتے ہیں اسی طرح کوئی جنّ ان پر بھی القاء کرتا ہے جس کو یہ فرشتہ سمجھتے ہیں۔

قریش کے اس الزام کی تردید قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء کے آخر میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو زیر بحث آئے ہیں۔ یہاں اسی الزام کی تردید ایک مختلف نہج سے کی جا رہی ہے جس کا آغاز ستاروں کے غروب اور سقوط کی قسم سے ہوا ہے۔

ستاروں کے غروب اور سقوط کی شہادت

ستاروں کے غروب یا ان کے سقوط سے قرآن نے دو پہلوؤں سے عربوں کے اس تصور پر ضرب لگائی ہے جو وہ کاہنوں اور منجّموں سے متعلق رکھتے تھے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ یہ سورج اور چاند اور یہ تمام نجوم و کواکب نہ خود اپنے اختیار سے کوئی تصرّف کرتے ہیں نہ بذاتِ خود موثر یا نافع و ضار ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں مسخر اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ ان کا پوری پابندی کے ساتھ، ایک مقررہ نظام الاوقات کے مطابق، طلوع و غروب خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ بذاتِ خود کسی اقتدار و اختیار کے مالک نہیں ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ عبادت کے حق دار ہیں نہ اس بات کے کہ ان کو وحی و الہام کا مصدر سمجھ کر ان سے رجوع کیا جائے یا ان کو آفات کا منبع خیال کر کے ان کی دہائی دی جائے یا ان کو خیر و برکت کا مرکز مان کر ان سے دعا و التجا کی جائے؛ بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے اللہ کے بندوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی انہی کی طرح اللہ ہی کی بندگی اور اسی کو سجدہ کریں۔ یہ مضمون قرآن میں یوں تو گوناگوں شکلوں میں بیان ہوا ہے لیکن خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کی وہ حجّت جو انھوں نے اپنی قوم پر تمام کی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ کہانت کی گرم بازاری جس طرح جنّات و شیاطین کے تعلق سے تھی اسی طرح ستاروں کی گردش اور ان کے اثرات سے بھی اس کا نہایت گہرا ربط تھا۔ قرآن نے یہاں وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی کہہ کر اس کے اسی پہلو پر ضرب لگائی ہے کہ ستارے تو خود اپنے عمل سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ

خالقِ کائنات کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی کے حکم سے وہ طلوع ہوتے اور اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں، تو احمق ہیں وہ لوگ جو ان سے الہام حاصل کرنے یا لوگوں کی تقدیر معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ احمق ہیں وہ جو اللہ کے رسول کو نجومی یا کاہن بتاتے ہیں درآنحالیکہ ان کی ساری تعلیم ان خرافات پر ایک ضرب کاری ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ کاہنوں کا یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے کہ ان کا ربط ایسے جنّوں سے ہے جو آسمان کی خبریں معلوم کرکے ان کو بتاتے ہیں۔ غیب تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ جو جنّات و شیاطین غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمانوں میں گھات میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو کھدیڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ سورۂ صٰفّٰت میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (الصّٰفّٰت ۱۰)	مگر جو کوئی کچھ اچک لینے کی کوشش کرے تو اس کا تعاقب کرتا ہے ایک شہابِ ثاقب۔

اللہ تعالیٰ کے اس انتظام کا اعتراف خود جنّات نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۚ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن ۹)	اور یہ کہ ہم آسمان کے ٹھکانوں میں غیب کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو سننے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنے لیے ایک شہاب کو گھات میں پائے گا۔

انہی ٹوٹنے والے ستاروں یا آسمانی راکٹوں کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ، ۷۵-۸۰، سورہ حاقّہ: ۳۸-۴۳ اور سورۂ تکویر، ۱۵-۲۵ میں قرآن کریم کو شیطانی چھوت سے بالکل پاک اور بالاتر قرار دیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ قرآن کی حریمِ قدس تک کسی جن و شیطان کو رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ شیاطین نہ اس لوحِ محفوظ تک پہنچ سکتے ہیں جس میں قرآن محفوظ ہے، نہ اس جلیل القدر فرشتہ کو متاثر کر سکتے جو اس کو لے کر اترتا ہے اور نہ اس رسول ہی کو گمراہ کر سکتے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ شیاطین ان کاہنوں پر اترتے ہیں جو بالکل جھوٹے اور نابکار ہوتے ہیں اور محض لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ڈھکوسلے بناتے اور غیب دانی کے دعوے کرتے ہیں۔

بعض الفاظ کی وضاحت قسم اور مُقسَم علیہ کا تعلق سمجھ لینے کے بعد ان آیتوں کے الفاظ اور ان کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

'مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'۔ 'ضَلّ' عام طور پر انسان کی اس گمراہی کے لیے آتا ہے جس کا تعلق بھول چوک یا فکر و اجتہاد کی غلطی سے ہو اور 'غَوٰی' کا تعلق اس گمراہی سے ہوتا ہے جس میں نفس کی اکساہٹ اور آدمی کے قصد و ارادہ کو بھی دخل ہو۔

لفظ 'صاحب' یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ضمیر خطاب کے مخاطب قریش ہیں۔ ان کو خطاب کرکے کہا جا رہا ہے کہ یہ پیغمبر جو تمہارے اپنے دن رات کے ساتھی ہیں تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ تم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے رجحان و ذوق سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم نے کب ان کے اندر کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے یہ شبہ بھی ہو سکے کہ ان میں کہانت یا نجوم کا کوئی میلان پایا جاتا ہے۔ اس طرح کا ذوق کسی کے اندر ہوتا ہے تو دن رات کے ساتھیوں سے وہ عمر بھر چھپا نہیں رہتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اتنی مدت تک تم نے ان کے اندر کبھی محسوس نہیں کی اب جب انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تم کو اللہ کا کلام سنایا تو تم نے ان کو کاہن اور نجومی کہنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی زندگی اور ان کا کلام شاہد ہے کہ ان کے اندر کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

'وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی'۔ 'عَنْ' یہاں منبع و منشا کا سراغ دینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کلام وہ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا کوئی تعلق نفس اور اس کی خواہشوں سے نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر وحی ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لیے اتاری جا رہی ہے۔ اس ٹکڑے میں کاہنوں اور نجومیوں پر تعریض ہے کہ ان کا کلام تو تمام تر ان کے نفس کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کلام کا منبع و مصدر اور ہے۔

جوہر جام جم از کان جہان دگر است

اس آیت میں اصلاً تو بیان قرآن کا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے چنانچہ آگے کی آیت 'اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی' سے اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ لیکن نبی چونکہ معصوم اور اس کا ہر قول و فعل لوگوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے عام زندگی میں بھی اس کی کوئی بات حق و عدل سے ہٹی ہوئی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اس سے کوئی فروگزاشت صادر ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتا ہے۔

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵)

حضرت جبریلؑ کی صفات

کلام اور صاحب کلام کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ اس فرشتہ (حضرت جبریلؑ) کی صفت بیان ہو رہی ہے جس نے اس کلام کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی۔ فرمایا کہ وہ 'شَدِیْدُ الْقُوٰی' یعنی تمام اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور اور اس کی ہر صفت و صلاحیت نہایت محکم و مضبوط ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری روح اس کو متاثر یا مرعوب کر سکے، اس سے خیانت کا ارتکاب کرا سکے یا اس کی تعلیم میں کوئی خلطِ مبحث کر سکے یا اس سے کوئی فروگذاشت ہو سکے یا اس کو کوئی وسوسہ لاحق ہو سکے۔ اس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے اس کو محفوظ رکھا ہے تاکہ جو فرض اس کے سپرد فرمایا ہے اس کو وہ بغیر کسی خلل و فساد کے پوری دیانت و امانت کے ساتھ ادا کر سکے۔ سورۂ تکویر میں اس فرشتہ کی تعریف یوں آئی ہے: 'اِنَّہٗ

لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ' (۱۹-۲۱)

(یہ ایک باعزت فرستادہ کی وحی ہے، وہ بڑی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بارسوخ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے، مزید برآں وہ نہایت امین ہے)۔

'ذُوْمِرَّةٍ' یعنی وہ اپنی عقل اور اپنے کردار میں نہایت محکم ہے۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ کوئی دھوکا کھا سکے یا کوئی اس کو دھوکا دے سکے یا وہ کسی کے ہاتھ بک سکے اور کوئی اس کو خرید سکے۔ یہ لفظ اخلاقی وعقلی برتری کے لیے آتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات کاہنوں اور نجومیوں کے مصدر الہام کی تحقیر ہی کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں بلکہ یہود اور ان کے ہم مشرب روافض نے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر آئے ہیں آپ پر نعوذ باللہ خیانت، جانب داری اور بے بصیرتی کا الزام لگایا ہے اور اسی بنا پر ان کو حضرت جبریل علیہ السلام سے ہمیشہ عداوت بھی رہی ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۶-۱۰)

جبریلؑ کا طریقۂ تعلیم

'ذُوْمِرَّةٍ' کا تعلق 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' سے ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت ہم نے 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' کے ساتھ ہی کر دی ہے۔ اب 'فَاسْتَوٰى' سے آگے اس تعلیم کے طریقہ کی وضاحت ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر 'عَلَّمَهٗ' کے لفظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس مقرب فرشتے نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ 'فَاسْتَوٰى' میں 'فَ' تفصیل کے لیے ہے، یعنی پہلے وہ اپنی اصل صورت میں، مستوی القامت ہو کر، نمودار ہوا۔ اس کے نمودار ہونے کی جگہ آسمان کی افق اعلیٰ میں تھی۔ 'اُفُقِ اَعْلٰى' سے مراد وہ افق ہے جو سمت راس میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز سمت راس کے افق سے نمایاں ہوگی تو چودھویں کے چاند اور دوپہر کے سورج کی طرح وہ بالکل صاف شفاف، جلی اور غیر مشتبہ صورت میں نظر آئے گی۔ اس کے برعکس مشرق یا مغرب یا شمال یا جنوب کے افق سے اگر کوئی چیز نمودار ہوگی تو وہ خفی صورت میں نمودار ہوگی جس طرح پہلی کا چاند نکلتا ہے۔ مقصود اس وضاحت سے یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ اپنی اصلی ہیئت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے افق اعلیٰ کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلی آنکھوں سے ان کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔

'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى'۔ 'تَدَلّٰى' کے معنی جھک پڑنے یا لٹک آنے کے ہیں۔ یہ بیان ہے اس بات کا کہ اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے کے قصد سے آپ کے قریب آئے اور جس طرح شفیق اور بزرگ استاد اپنے عزیز و محبوب شاگرد پر غایت شفقت سے جھک پڑتا ہے اسی طرح آپ کے اوپر جھک پڑے۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ دور سے اپنی بات پھینک ماری ہو اور اس امر کی پروا نہ کی ہو کہ

آپ نے بات اچھی طرح سنی یا نہیں اور سنی تو سمجھی یا نہیں بلکہ پورے التفات و اہتمام سے اس طرح آپ کے کان میں بات ڈالی کہ آپ اچھی طرح سن اور سمجھ لیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کاہنوں کے شیاطین کا جو علم ہوتا ہے اس کو قرآن نے خطف الْخَطْفَةَ (والصّٰفّٰت : ۱۰) سے تعبیر کیا ہے یعنی اُچکی ہوئی بات، جس طرح چور اور اُچکے کوئی چیز اُچک لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اُستاد اُچکے ہیں تو وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم بھی اُچکوں ہی کی طرح دیتے ہوں گے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل علیہ السلام کے طریقۂ تعلیم کا اس لیے نمایاں فرمایا ہے کہ دونوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو سکے۔

'فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى' ۔ 'قاب' کے معنی بقدر کے ہیں یہ غایت قرب و اتصال کی تعبیر ہے۔ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے قریب ہوگئے کہ بس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس تشبیہ میں اہل عرب کے ذوق کا بھی لحاظ ہے۔ اہل عرب تیر و کمان والے لوگ تھے اس وجہ سے غایت قرب کی تعبیر کے لیے ایک کمان یا دو کمانوں کے بقدر کی تشبیہ استعمال کرتے تھے، جس طرح ہم ایک گز یا دو گز کے الفاظ بولتے ہیں۔ 'اَوْ' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ تشبیہ محض قرب کی تعبیر کے لیے ہے۔ یہ فاصلہ اس سے بھی کم ہو سکتا ہے۔

'فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى' ۔ 'اَوْحٰى' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور حضرت جبریلؑ بھی۔ پہلی صورت میں مطلب بالکل واضح ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی۔ دوسری صورت میں مضاف الیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا، یعنی اس توجہ و اہتمام کے ساتھ جبریل علیہ السلام نے اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی یا وہ وحی کی جو اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کو کرنے کے لیے ہدایت فرمائی۔ میرا رجحان پہلے قول کی طرف ہے، ویسے دوسرے قول میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ بعض صوفیوں نے اس سے یہ بالکل غلط نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا بندہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ، مثالوں کی روشنی میں، واضح کرتے آرہے ہیں کہ ضمیروں کے مرجع کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے۔ انتشار ضمیر ہر صورت میں عیب نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس سے ایجاز کا فائدہ ہوتا ہے جو کلام عرب میں داخل بلاغت ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱)

نبی صلعم کے مشاہدے کی تصدیق

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاہدے کی تصدیق و تصویب ہے کہ کوئی اس مشاہدے کو دل کی خیال آرائی اور نفس کے فریب پر محمول نہ کرے، یہ فریب نفس اور دھوکا نہیں بلکہ فی الحقیقت نبی کو یہ مشاہدہ ہوا ہے۔

ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے ان مشاہدات کا ذکر کیا تو مخالفین نے آپ کا مذاق اڑایا کہ جس قسم کے ارمان اس شخص کے دل میں لپٹے ہوئے ہیں اسی قسم کے خواب اس کو نظر آتے ہیں اور

یہ خواب کو حقیقت گمان کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان کو سناتا پھرتا ہے، حالانکہ یہ تمام ترفریبِ نفس اور ذہن کی خیال آرائی ہے۔ قرآن نے اس الزام کی تردید مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ کی ہے۔ سورۂ تکویر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس پر مفصل بحث آئے گی۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی (۱۲)

یہ مخالفین کو مخاطب کر کے ان کو ملامت فرمائی ہے کہ کیا تم پیغمبرؐ سے اس کے مشاہدات پر جھگڑتے ہو؟ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے اس سے تم کو آگاہ کر رہا ہے۔ اگر یہ چیز تم کو نظر نہیں آتی تو اس سے نفسِ حقیقت باطل نہیں ہو جائے گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ مخالفین اپنے کاہنوں کی تو ساری خرافات بے دریغ تسلیم کر لیتے تھے اس لیے کہ ان کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی تھی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان کی خواہشوں کے خلاف تھی اس وجہ سے آپ کی مخالفت کے لیے طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی (۱۳-۱۵)

دوسرا شاہدہ

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ پیغمبرؐ کو یہ مشاہدہ صرف ایک ہی بار ہوا ہو اس وجہ سے اس کو کوئی واہمہ یا مغالطہ قرار دیا جا سکے بلکہ اسی طرح انھوں نے دوبارہ بھی جبریلؑ کو سدرۃ المنتہٰی کے پاس دیکھا جس کے پاس ہی جنت الماویٰ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا جو مشاہدہ تمھارے سامنے وہ بیان کر رہے ہیں وہ مذاق اڑانے کی چیز نہیں بلکہ سنجیدگی سے غور کرنے کی چیز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف دو ابتدائی مشاہدوں کا حوالہ ان لوگوں کے جواب میں دیا گیا ہے جنھوں نے شروع شروع میں آپ کے ان مشاہدات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو ہی بار دیکھا۔ ان دو ابتدائی مشاہدات کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کا ظہور مختلف شکلوں اور مختلف اوقات میں تواتر کے ساتھ ہونے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت جبریلؑ کی آمد سے زیادہ نہ کسی کی آمد معلوم و معروف تھی نہ محبوب و مطلوب۔

'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی'

'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی' وہ مقام ہے جہاں اس عالم ناسوت کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ 'سِدْرَة' بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بیری کا درخت عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ ہمارے لیے یہ سارا عالم نادیدہ ہے۔ نہ ہم عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے حدود کو جانتے اور نہ ان دونوں کے درمیان کے اس نشانِ فاصل کی حقیقت سے واقف ہیں جس کو یہاں 'سدرۃ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ چیزیں متشابہات میں داخل ہیں اس وجہ سے، قرآن کی ہدایت کے مطابق، ان پر ایمان لانا چاہیے، ان کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں ہے۔ ان کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جن کا علم راسخ ہوتا ہے ان کے علم میں ان چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ان کی حقیقت جاننے کے درپے ہوتے ہیں وہ ٹھوکر کھاتے اور گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

'عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی'۔ یہ 'سِدْرَۃُ الْمُنْتَهٰی' کے مقام کی نشان دہی فرمادی کہ اس کے پاس 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' بھی ہے۔ 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' پر سورہ سجدہ کی آیت ۱۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح 'سِدْرَۃُ الْمُنْتَهٰی' عالمِ ناسوت کی آخری حد پر ہے اسی طرح 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' عالمِ لاہوت کے نقطۂ آغاز پر ہے۔ اس نشان دہی سے یہ بات واضح ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا دوبارہ شاہدہ دونوں عالموں کے نقطۂ اتصال پر ہوا۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱۶)

شاہدے کی کیفیت حیطۂ بیان سے باہر ہے

یہ اس مشاہدے کی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ 'سدرۃ' کو چھائے ہوئے تھی جو چیز چھائے ہوئے تھی۔ یہ اسلوبِ بیان اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس وقت اس 'سدرۃ' پر انوار و تجلّیات کا ایسا ہجوم تھا کہ ان کی تعبیر الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۱۷)

تجلیات کے ہجوم میں پیغمبر کا قرار و سکون

جس طرح اوپر ارشاد ہوا ہے 'مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی' (۱۱) (جو کچھ اس نے دیکھا وہ دل کی خیال آرائی نہیں تھی) اسی طرح بیان فرمایا کہ اس مشاہدے کے موقع پر بھی نہ تو نگاہ بہکی اور نہ بے قابو ہوئی، بلکہ پیغمبر نے جو کچھ مشاہدہ کیا پورے قرار و سکون اور پوری دل جمعی کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

'زیغ' کے معنی کج ہونے کے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کسی جلوے کے مشاہدے میں اس کے صحیح زاویے سے کج نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اس کے بالکل صحیح زاویے سے کیا۔ 'طغٰی' کے معنی بے قابو ہونے کے ہیں۔ یعنی اگرچہ انوار و تجلّیات کا ایسا ہجوم تھا کہ الفاظ اس کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہیں لیکن آپ کی نگاہ ذرا بھی بے قابو نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اچھی طرح جم کر کیا۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی (۱۸)

اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں کا شاہدہ

یہ بیان ہے ان مشاہدات کا جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئے۔ فرمایا کہ اس نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ ان نشانیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی کہ نہ الفاظ ان کے متحمل ہو سکتے اور نہ وہ ہماری عقل کی گرفت میں آسکتیں تاہم لفظ 'کُبرٰی' دلیل ہے کہ یہ نشانیاں ان نشانیوں سے بالاتر تھیں جن کا مشاہدہ، آفاق و انفس میں، ہر قدم پر، ہر صاحبِ نظر کو ہوتا رہتا ہے۔ مفسرین نے ان سے وہ مشاہدات مراد لیے ہیں جو حضورؐ کو معراج کے موقع پر ہوئے۔ ان کی اس رائے کے حق میں یہ قرینہ موجود ہے کہ سورۂ اسراء میں ذکر ہے کہ اس موقع پر آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ آپ کو مشاہدہ صرف اپنے رب کی نشانیوں ہی کا ہوا، خود اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کا کوئی اشارہ یہاں نہیں ہے۔

اب اس تمہیدی بحث کا خلاصہ بھی سامنے رکھ لیجیے تاکہ آگے کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

جو لوگ قرآن کریم کو نجوم و کہانت کے قسم کی چیز قرار دے کر اس کی وقعت گھٹانی چاہتے تھے ان کو خطاب کر کے مندرجہ ذیل حقائق ان کے سامنے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ یہ قرآن جس روزِ جزا و سزا سے تم کو آگاہ کر رہا ہے اس کو کوئی معمولی بات نہ سمجھو۔ یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کی سفوات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کے پیش کرنے والے نے خود اپنے جی سے گھڑلی ہو۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے جو اس نے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے اپنے اس خاص بندے پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ وہ تمھیں اس آنے والے دن سے، اس کے ظہور سے پہلے، اچھی طرح آگاہ کر دے۔

۲۔ جس فرشتے کے ذریعہ سے یہ وحی آئی ہے وہ خدا کا نہایت مقرب فرشتہ ہے اس وجہ سے اس اہم ذمہ داری کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب فرمایا۔ وہ نہایت امین ہے، خدا کی امانت میں وہ کوئی خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ نہایت قوی ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی دوسری طاقت اس کو مرعوب یا مغلوب کر سکے۔ وہ تمام اعلیٰ علمی و اخلاقی صفات سے متصف ہے، اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی مغالطہ میں مبتلا ہو سکے یا کوئی اسے دھوکا دے سکے یا وہ کسی کی جانب داری یا کسی کی ناحق مخالفت کرے۔

۳۔ اس فرشتہ کو پیغمبرؐ نے دوبار نہایت وضاحت سے دیکھا ہے۔ پہلی بار اس کا مشاہدہ افقِ اعلیٰ میں ہوا اور دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ محض کوئی وہم تھا جو اس کو لاحق ہوا اور اس نے اس کو تمھارے سامنے بیان کر دیا۔

۴۔ فرشتہ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تعلیم دی وہ ایک شفیق استاد کی طرح نہایت قریب سے، اس کے اوپر جھک کر دی جس کو پیغمبرؐ نے اچھی طرح سنا اور سمجھا۔ یہ نہیں ہوا کہ دور سے اس کے کانوں میں کوئی آواز آ پڑی ہو جس کے سننے یا سمجھنے میں کوئی شبہ یا تردد لاحق ہوا ہو۔

۲۔ آگے آیات ۱۹-۳۰ کا مضمون

آگے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم کو اس اہتمام کے ساتھ روزِ جزا و سزا سے جو ڈرایا جا رہا ہے تو آخر کس بل بوتے پر اس سے بےخوف بیٹھے ہو! کیا اپنی مزعومہ دیویوں —— لات، عزّیٰ اور منات —— کی سفارش کے بھروسہ پر! اگر اس وہم میں مبتلا ہو تو یاد رکھو کہ یہ تمھارے رکھے ہوئے محض فرضی نام ہیں جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ جزا و سزا ایک حقیقت ہے، حقیقت کا مقابلہ تم محض اٹکل پچو مفروضات سے نہیں کر سکتے۔ تم نے یہ جھوٹی آرزوئیں اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں یہ محض تمھاری خواہشیں ہیں، ضروری نہیں کہ یہ پوری بھی ہو جائیں۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات اللہ ہی کے ہی اختیار میں ہیں۔ کسی فرشتہ کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے اذن کے بدون زبان ہلا سکے۔ جن لوگوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں اور ان کی سفارش کے بل پر قرآن کے انذار سے بالکل بے پروا ہیں، انھوں نے

آخرت کی مسئولیت سے فرار کے لیے یہ ایک چور دروازہ نکالا ہے لیکن یہ چیز ذرا بھی ان کو نفع پہنچانے والی نہیں بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نیک اور بد دونوں قسم کے لوگوں کو سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹-۳۰

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾ وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴿٢٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾ فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿٣٠﴾

ترجمہ آیات ۱۹-۳۰

بھلا، کبھی غور کیا ہے لات اور عزیٰ اور منات پر جو تیسری اور درجہ کے اعتبار سے دوسری ہے! تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں،

اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے نہایت واضح ہدایت آ چکی ہے۔ ۱۹-۲۳

کیا انسان وہ سب کچھ پالے گا جو وہ تمنا رکھتا ہے! سو یاد رکھو کہ آخرت اور دنیا سب خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے۔ ۲۴-۲۶

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں۔ حالانکہ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں۔ تو تم ان لوگوں سے اعراض کرو جنھوں نے ہماری یاد دہانی سے اعراض کیا ہے اور جن کا مطلوب صرف دنیا کی زندگی ہی ہے۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ یاب ہیں۔ ۲۷-۳۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ (۱۹-۲۰)

قریش کو ملامت

سوال یہاں تعجب اور استخفاف و تحقیر کے لیے ہے۔ اوپر آپ نے حضرت جبریلؑ کی صفات ملاحظہ فرمائیں کہ وہ شَدِيدُ الْقُوَىٰ اور ذُو مِرَّةٍ ہیں۔ دوسرے مقام میں ان کی تعریف مُّطَاعٍ (التکویر: ۲۱) اور عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (التکویر: ۲۰) کے الفاظ سے بھی آئی ہے۔ ان صفات کے مضمرات کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، یہاں ان کا ایک اور خاص پہلو بھی قابل توجہ ہے جو اس آیت کے تحقیر آمیز اسلوب کلام سے سامنے آتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات نہایت اعلیٰ مردانہ صفات

ہیں۔ گویا قریش کو اس جلیل القدر فرشتہ کی ان صفات کا حوالہ دے کر ملامت کی گئی ہے کہ ذرا دیکھو! کہاں یہ اعلیٰ مردانہ صفات کے ملائکہ اور کہاں تمہاری یہ دیویاں ——— لات، عزّیٰ اور منات ——— جن کی نسبت تمہارا یہ گمان ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور جن کے نام تم نے عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں!

مشرکین کی تین عالی مرتبہ دیویاں

آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے۔ فرشتوں کی نسبت، جیسا کہ جگہ جگہ اس کتاب میں وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہر بات مانتا ہے اس وجہ سے وہ اپنے پجاریوں کو اس دنیا میں بھی رزق و اولاد دلواتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ان کو بخشوا لیں گی۔ خاص طور پر ان تینوں دیویوں کا ان کے ہاں بڑا مرتبہ تھا۔ ان کی سفارش بے خطا سمجھی جاتی تھی۔ ان کی نسبت ان کا عقیدہ تھا کہ 'تلک الغرانیق العلٰی وان شفاعتھن لترتجیٰ' یہ بڑے مرتبے کی دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی قبولیت کی پوری امید ہے۔

اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قبائلِ عرب میں سے کون ان میں سے کس کو پوجتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص قبیلہ کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ کچھ زیادہ خصوصیت رہی ہو لیکن ان کی عظمت تمام مشرکین کے نزدیک یکساں مسلّم تھی۔ قریش نے سارے عرب پر اپنی سیاسی و مذہبی پیشوائی کی دھاک جمائے رکھنے کے لیے تمام دیویوں دیوتاؤں کی مورتیاں خانۂ کعبہ میں بھی جمع کر چھوڑی تھیں۔ ان تینوں دیویوں کے پجاریوں کی تعداد چونکہ سارے عرب میں سب سے زیادہ تھی اس وجہ سے قریش بھی ان کی سب سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔

ان دیویوں میں فرقِ مراتب

قرآن کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ تینوں دیویاں اس اعتبار سے اگرچہ ایک ہی زُمرے سے تعلق رکھنے والی تھیں کہ یہ سب عالی مرتبہ خیال کی جاتی تھیں تاہم ان میں باہم فرقِ مراتب بھی تھا۔ لات اور عزّیٰ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا۔ 'منات' اگرچہ زمرہ میں انہی کے اندر شمار ہوتی تھی لیکن مرتبے کے لحاظ سے یہ ان سے فروتر تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس کا ذکر دو صفتوں کے ساتھ کیا ہے۔ ایک 'ثَالِثَۃَ' اور دوسری 'اُخْرٰی'۔ پہلی صفت اس کے زمرے کا پتہ دیتا ہے کہ یہ انہی تین کی تیسری ہے؛ دوسری صفت 'اخرٰی' اس کے درجے کا پتہ دیتی ہے کہ ہر چند یہ شامل تو انہی میں تھی لیکن یہ دوسرے نمبر پر تھی۔ 'اولیٰ' اور 'اخرٰی' کے الفاظ درجے کو واضح کرنے کے لیے عربی زبان میں بھی معروف ہیں اور اس مفہوم کے لیے قرآن میں بھی یہ آئے ہیں: 'وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ' (الاعراف: ۳۹) والی آیت میں اس کی نظیر موجود ہے۔

ان ناموں کے اشتقاق سے متعلق بعض اشارات

ان ناموں کے اشتقاق اور ان کے معانی سے متعلق جو بحثیں تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں ان کا بیشتر حصہ بے بنیاد ہے۔ ہمارے نزدیک 'اللّٰت' تو 'الالٰھۃ' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس طرح معبودِ اعظم کے لیے 'اللہ' تھا اسی طرح بڑی دیوی کے لیے انھوں نے 'الالٰھۃ' اختیار کیا جس کو عوام نے اپنے کثرتِ استعمال سے 'اللّٰت' بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کو 'لتّ' کے مادہ سے لیا ہے، جس کے معنی گوندھنے اور لت کرنے کے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو زمانۂ حج میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ اس کے

مرنے کے بعد لوگوں نے اس کی قبر کی پوجا شروع کر دی اور اس نام سے وہ ایک معبود بن گیا۔ یہ رائے اشتقاق کے قاعدے کی رُو سے بھی غلط ہے اور قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ قرآن کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ دیویوں کے بُت تھے اور یہ دیویاں فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔

'عُزّٰی' ظاہر ہے کہ 'عزیز' اور 'اَعَزّ' کی مؤنث ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں 'عزیز' ایک نمایاں صفت ہے جو اس کی عزت و عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی پہلو سے اس دیوی کے لیے 'عزّیٰ' کا نام اختیار کیا گیا۔

'مَنات' میرے نزدیک 'مُنْیَۃ' کے مادہ سے بنایا ہوا نام ہے جس کے معنی ہوں گے وہ دیوی جس کے قرب کی آرزو کی جائے یا جو آرزوؤں کے برآنے کا ذریعہ ہو۔

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی ﴿۲۱﴾ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۲۱-۲۲)

ستم بالائے ستم!

ان فقروں کا اسلوب طنز یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لیے تو لڑکے پسند کرتے ہو اور لڑکیوں سے اس درجہ نفرت کرتے ہو کہ جس کے ہاں لڑکی پیدا ہو جائے وہ شرم سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، تو جب لڑکیوں سے متعلق تمہارے احساسات یہ ہیں تو کم از کم اپنے رب پر اتنا کرم تو کیا ہوتا کہ جس چیز کو اپنے لیے اس درجہ ناپسند کرتے ہو وہ اس کی گود میں نہ ڈالتے! آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پیدا تو ہر چیز اللہ نے کی لیکن بیٹیاں تم اس کے حصے میں ڈالو اور بیٹے اپنے حصہ میں۔ یہ تقسیم تو نہایت غیر منصفانہ اور بھونڈی تقسیم ہوئی! عدل و انصاف کا بدیہی تقاضا تو یہ تھا کہ جو چیز تم اپنے لیے ناپسند کرتے اس کو اپنے رب سے منسوب نہ کرتے۔

'ضِیْزٰی' کے معنی ہیں عدل و انصاف سے ہٹا ہوا معاملہ۔ 'ضَازَہٗ' کے معنی ہوں گے ظلمہٗ اس نے اس کے اوپر ظلم کیا، اس کے ساتھ ناانصافی کی۔

مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا سے بیٹے بیٹیاں منسوب کرنا ہی اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی اور عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے لیکن تم نے ستم پر ستم یہ کیا ہے کہ اس سے منسوب وہ چیز کی ہے جس کو خود اپنے لیے شرم کی چیز خیال کرتے ہو! گویا اللہ کا مرتبہ تمہارے نزدیک تم سے بھی فروتر ہے۔

اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی (۲۳)

نام جن کا کوئی مسمّٰی نہیں ہے

یہ ان دیویوں کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ محض تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رکھے ہوئے نام ہیں جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ 'مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' ان کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہو جو تم اپنی تائید میں پیش کر سکو۔ اگر تم نے اپنے باپ دادا کو ان کو پوجتے پایا تو یہ بھی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ انھوں نے بھی اسی طرح اپنے اگلوں کی اندھی تقلید کی جس طرح تم کر رہے ہو۔ خدا کی اتاری ہوئی دلیل ہو سکتی تھی تو یہ کہ تمہاری عقل و فطرت میں ان کے لیے کوئی گواہی موجود ہوتی یا آفاق و انفس کے دلائل سے

ان کی تائید ہوتی یا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہ خبر دی ہوتی کہ فلاں اور فلاں میری چہیتی بیٹیاں ہیں، میں ان کی سفارش لازماً قبول کروں گا اور ان کی پرستش کرنے والوں کو ضرور بخش دوں گا۔ جب اس طرح کی کوئی چیز بھی ان کے حق میں موجود نہیں ہے تو یہ محض تمھاری اور تمھارے باپ دادا کی اپنی گھڑی ہوئی دیویاں ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اللہ کی ہدایت کے مقابل میں خواہشِ نفس کی پیروی

'اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ج وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى'۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا۔ اس میں اسلوب غائب کا ہو گیا ہے۔ یہ ان کی محرومی اور بدبختی پر ان کو ملامت اور ان کی ذہنی پستی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ نے تو ان کی رہنمائی کے لیے خاص اپنے پاس سے ہدایت اتاری لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی جگہ اپنے گمان اور اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

لفظ 'الھدیٰ' یہاں اس ہدایت کے لیے استعمال ہوا ہے جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اور جس کی عظمت و طہارت کا ذکر تمہید کی آیتوں میں ہوا ہے۔ 'ظن' اور خواہشِ نفس کی پیروی یوں تو کسی حال میں بھی خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن خدا کی ہدایت کے موجود ہوتے ان کی پیروی کرنا اپنے آپ کو پورے دن کی روشنی میں ہلاکت کے کھڈ میں گرانا ہے۔

ہر بدعت خواہشِ نفس سے وجود میں آتی ہے

'مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ' سے یہاں اشارہ خاص طور پر ان کی اس بدعتِ شرک کی طرف ہے جو زیر بحث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بدعت کی بنیاد انسان کے نفس کی کسی نہ کسی خواہش پر ہوتی ہے۔ جب انسان کا نفس کسی حقیقت کے تقاضے پورے کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا اور اس کا انکار بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تو وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بظاہر اس کا انکار بھی نہ ہو اور اس کے اقرار سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے فرار کی کوئی آسان راہ بھی نکل آئے۔ آپ جس بدعت پر بھی غور کیجیے اس کی تہ میں خواہشِ نفس کا یہ خناس آپ کو چھپا ہوا ملے گا۔

ان دیویوں کے حق میں ظاہر ہے کہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں تھی، لیکن جزا اور سزا کی ہر خلش سے مامون کر دینے کے لیے شیطان نے ان مشرکین کو یہ فریب دیا کہ فرشتے خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ خاص طور پر اس کی فلاں اور فلاں بیٹیاں اس کو بہت محبوب ہیں۔ وہ ان کی ہر بات سنتا اور مانتا ہے۔ اس کے حضور میں ان کی ہر سفارش تیر بہدف ہے اس وجہ سے جو ان کی جے پکاریں گے اور ان کے تھانوں پر قربانی پیش کر دیا کریں گے، ان کو وہ خدا سے سفارش کر کے، اس دنیا میں بھی رزق و اولاد سے بہرہ مند کرائیں گی اور اگر آخرت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو وہاں بھی ان کو بڑے درجے دلوائیں گی۔ دیکھیے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی کیسی آسان راہ نکل آئی اور آخرت کے حساب و کتاب اور جزا و سزا کا ہر خطرہ کیسی آسانی سے دور ہو گیا!

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

لیکن غور کیجیے کہ خواہشِ نفس کے سوا اور کیا چیز ہے جس پر اس ساری میتھالوجی (MYTHOLOGY) کی بنیاد ہو۔ نفس نے چاہا کہ خدا کے تقرب اور اس کی جنت کے حصول کی کوئی ایسی راہ نکل آئے جس میں اپنی کسی خواہش کی قربانی نہ دینی پڑے۔ شیطان نے یہ راہ نکال دی۔

أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ۝ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ (۲۴-۲۵)

خواہشیں حقائق کو نہیں بدل سکتیں

یہ اسی اوپر والی بات پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور اس پر تبصرہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی رہنمائی میں، اپنے جی کو خوش رکھنے کو، جو فلسفہ چاہو بنا ڈالو لیکن ضروری نہیں کہ تمھاری ہر تمنا اور خواہش پوری بھی ہو جائے۔ حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تب دیکھ لوگے کہ تم جو خیالی محل تعمیر کرتے رہے ہو اس کی بنیاد ریت پر تھی۔ تمھارے یہ معبود ذرا بھی کسی کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ ہر ایک کو سابقہ اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ جس کے نیک اعمال کی میزان بھاری ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور جس کی میزان ہلکی ہوگی وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا، خواہ کوئی ہو۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح مشرکین نے اپنے ان دیویوں دیوتاؤں کے بل پر بہت سی بے بنیاد تمنائیں اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں اسی طرح یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں نے بھی اپنے دلوں میں بہت سی جھوٹی آرزوئیں پال رکھی ہیں جو محض خواہشِ نفس کی ایجاد سے وجود میں آئی ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کی ان بے بنیاد آرزوؤں کی، جس کو قرآن نے 'امانی' سے تعبیر کیا ہے، تفصیل سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے ان کی تقلید میں جو عقیدے کتاب و سنت کے بالکل خلاف ایجاد کیے ہیں ان پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتابوں ——— حقیقتِ شرک اور حقیقتِ توحید ——— میں کی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں لفظ 'انسان' سے خطاب کر کے گویا بلا استثنا سب کو آگاہی دی ہے کہ آرزوئیں اور تمنائیں جس کا جو جی چاہے پال رکھے لیکن یاد رکھے کہ کسی کی آرزوؤں کی خاطر نہ حقائق میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ خدا کا قانون سر مو کسی کی جانب داری کرے گا۔

'فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ'۔ یعنی اگر کوئی اس طمعِ خام میں مبتلا ہے کہ کسی کی خواہشوں کی خاطر خدا کی کسی سنت یا اس کے کسی قانون میں کوئی تبدیلی ہو جائے گی تو وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ دنیا اور آخرت دونوں کلیتہً خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اذن کے بدون کوئی سفارش کر سکے یا اس کے کسی قانون یا فیصلہ کو تبدیل کرا سکے۔

ملائکہ کی شفاعت بھی اللہ کے اذن پر منحصر ہے

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ (۲۶)

یہ اسی اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ ان مشرکین کی ان دیویوں کا تو کیا ذکر آسمانوں میں

کتنے ہی فرشتے، بڑے اور چھوٹے، موجود ہیں جن کی شفاعت ذرا بھی کسی کے کام آنے والی نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ ان میں سے کسی کو کسی کے باب میں شفاعت کی اجازت دے۔ اوّل تو کوئی خدا کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا اور جو اذن کے بعد زبان کھولے گا بھی تو صرف اسی کے باب میں کھولے گا جس کے لیے خدا یہ پسند فرمائے کہ اس کی سفارش کی جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَىٰ (۲۷)

شرک کی دیومالا کے مصنفین

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کون لوگ ہیں جنھوں نے یہ ساری دیومالا گھڑی ہے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی ہیں تو اس کی اصل حقیقت، یعنی اس بات پر ان کا ایمان نہیں ہے کہ وہ دن خدا کے کامل عدل کے ظہور کا دن ہوگا اور ہر ایک ٹھیک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جنھوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر یہ دیومالا تصنیف کی ہے کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، انھی کی سفارش سے اس دنیا کی نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو یہی اس دن بھی ہمارا مرجع بنیں گی اور ہمیں وہ سب کچھ دلوائیں گی جو ہم چاہیں گے۔

وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۲۸)

شرک کی تمام تر بنیاد ظن پر ہے

فرمایا کہ آخرت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بچانے کے لیے انھوں نے یہ افسانہ ایجاد تو کر ڈالا لیکن اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں بلکہ محض ظن پر ہے۔ محض اپنی خواہشِ نفس کو حقیقت بنانے کے لیے یہ اٹکل کے تیر تکے چلائے گئے ہیں۔ ان نادانوں کو خبر نہیں کہ اٹکل بہرحال اٹکل ہے، یہ حق و حقیقت کا بدل کسی درجے میں نہیں ہو سکتی۔ جب حقیقت ظاہر ہوگی تب ان کو پتہ چلے گا کہ یہ عمر بھر محض خواب دیکھتے رہے ہیں۔

ظن اور علم میں فرق

لفظ 'ظن' آیت ۲۳ میں 'الھدیٰ' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ 'علم' کے مقابل کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور حق کے مقابل کی حیثیت سے بھی۔ علم انسان کو اس کی فطرت اور عقل کی راہ سے بھی حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی سے بھی۔ جو علم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ در اصل 'الھدیٰ' کا درجہ رکھتا ہے اس لیے کہ وہ ہر شبہ سے بالا ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کو حق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس بات کے حق میں نہ فطرت اور عقل کی گواہی موجود ہو نہ وحی کی شہادت وہ سرتاسر ظن ہے اور یہ بالکل باطل ہے۔ قرآن نے یہاں 'وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ' فرما کر ان مشرکین کے اس ساری دیومالا کو علم کے ہر سہارے سے محروم، ایک بالکل من گھڑت فسانہ قرار دیا ہے۔ یعنی نہ اس کی تائید میں ان کے پاس عقل کی کوئی دلیل ہے اور نہ وحی کی۔ اہلِ عرب اس حقیقت سے اچھی

طرح واقف تھے کہ جس بات کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو وہ علم نہیں بلکہ ظن ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

ایک شاعر نے 'ظن' اور 'علم' کے اس فرق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

وَاعلمُ عِلْمًا لیس بالظن انہٗ

(اور میں ایک علم پر مبنی بات جانتا ہوں جو ظن نہیں کہ ....)

لفظ 'ظن' کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ ہم آیت اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ (الحاقۃ: ۲۰) کے تحت کریں گے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۵ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۹)

ہدایت سے اعراض کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے سرپھرے ہیں کہ اللہ کی ہدایت کے مقابل میں اپنی ہوائے نفس کی، علم کے مقابل میں ظن کی اور حق کے مقابل میں باطل کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، تم ان کے زیادہ درپے نہ ہو۔ جب انھوں نے ہماری یاددہانی سے منہ پھیر لیا تو تم بھی ان سے اعراض کرو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب ذمہ داری ان کی ہے۔ یہ اس کا انجام خود دیکھیں گے۔

'ذکر' سے مراد یہاں قرآن مجید ہے۔ یہ لفظ قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم مختلف مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قرآن ان لوگوں کو آخرت اور اس کی ذمہ داریوں کی یاددہانی کر رہا ہے جو چند فرضی دیویوں کی سفارش کے بل پر اس سے بالکل نچنت بیٹھے ہیں۔

'وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا' یہ ان کے اس اعراض کی اصل علت کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصود صرف اس دنیا اور اس کی مرغوبات کو بنا لیا ہے۔ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز پر غور کرنے کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی (۳۰)

دنیا پرستوں کی تنگ نگاہی

یعنی ان لوگوں کے علم کی رسائی بس اس دنیا کے ظاہر ہی تک ہے، اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت پوشیدہ ہے اس تک ان کی رسائی نہ ہے اور نہ یہ اس کے طالب ہیں۔ حالانکہ اصل چیز وہی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے خالق کی قدرت و حکمت ایسی واضح ہے کہ ایک بلید کے سوا کوئی اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا اور ایک قدیر و حکیم ذات سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض ایک کھیل کے طور پر بنا ڈالے۔

'ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ' کے اسلوب بیان سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ محض ان کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی ہے کہ یہ اس کے ظاہر پر ریجھ کر اس کے باطن سے بے پروا ہو بیٹھے حالانکہ اس کی تمام ظاہری رونقیں

عارضی اور فانی ہیں۔ اصل ابدی بادشاہی تو اس کے پیچھے ہے جس کے لیے قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن یہ اپنی پست ہمتی اور محرومی کے سبب سے اس کا حوصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس پہلو کی وضاحت 'یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' (الروم: ۷) والی آیت میں ہوئی ہے۔

دنیا پرستوں کو تہدید

'اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ لا وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی'۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور ان سرگشتگانِ دنیا کو تہدید و وعید ہے۔ حضورؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ تم اب ان کو نظر انداز کرو۔ تمھارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان سے بھی اچھی طرح باخبر ہے جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ اس کا علم سب کو محیط اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ نہ وہ لوگ اس کی پکڑ سے بچ سکیں گے جو اس کی راہ سے برگشتہ ہیں اور نہ وہ لوگ اس کی نصرت و رحمت سے محروم رہیں گے جو اس کی راہ میں ہر قسم کے آلام کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

۴۔ آگے آیات ۳۱-۵۵ کا مضمون

آگے اسی مضمون کو جو اوپر والے ٹکڑے میں بیان ہوا ہے مزید واضح اور مؤکد فرمایا ہے۔

پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے قبضہ میں ہے۔ تمھارے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اس نے اپنا شریک نہیں بنایا ہے کہ وہ اس کے عدل و انصاف پر اثر انداز ہو سکے، چنانچہ وہ لازماً ان لوگوں کو سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور ان لوگوں کو صلہ دے گا جو نیکی کی زندگی بسر کریں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے سفارشیوں یا اپنے حسب و نسب یا بزرگوں کے ساتھ اپنی نسبت کے بل پر یا حرم اور حجاج کی چند ظاہری خدمتیں انجام دے کر اپنے منہ میاں مٹھو بنے پھر رہے اور اپنے آپ کو جنت کا پیدائشی حق دار سمجھ رہے ہیں، ان سب کو خدا جہنم میں بھر دے گا۔ اس کی پکڑ سے صرف وہی بچیں گے جو کھلی ہوئی حق تلفیوں اور بے حیائیوں سے بچتے رہیں گے۔ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی برائی وقتی طور پر صادر ہو جائے گی تو توبہ و اصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ جو لوگ اپنی برتری اور تقدس کے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، اللہ تعالیٰ ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا، انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ ان کی خلقت کس چیز سے ہوئی ہے۔ مٹی، کیچڑ اور نجس پانی کی بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی پاک دامنی اور برتری کی حکایت زیادہ نہیں بڑھانی چاہیے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی بر خود غلطی پر تعجب کیا ہے جو خدا کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے لیکن ابراہیمؑ و موسیٰؑ سے نسبت رکھنے کے زعم میں یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ آخرت میں ان کے

لیے اونچے اونچے مراتب محفوظ ہیں حالانکہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ نمایاں تعلیم یہی ہے کہ آخرت میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، بلکہ ہر ایک کے آگے اس کی اپنی کمائی ہی آئے گی۔

اس کے بعد یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خوشی اور غم، زندگی اور موت، رزق اور اولاد، غنیٰ اور فقر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جن لوگوں نے موسم بہار میں طلوع ہونے والے شعریٰ کو معبود بنا رکھا ہے کہ بہار کی رونقیں اس کی بخشش سے حاصل ہوتی ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شعریٰ کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس کے بعد پچھلی قوموں کا بالاجمال حوالہ دے کر قریش کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ قومیں بھی انہی گمراہیوں میں مبتلا ہوئیں جن میں تم مبتلا ہو تو ان کے انجام اور ان کی تاریخ سے سبق حاصل کرو اور خدا کے غضب کو دعوت نہ دو ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۵۵

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ

الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنٰى وَأَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُودَا فَمَا أَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۱-۵۵

اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے کیے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھّے کام کیے ہیں اچھّا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے۔ سو تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں رہے۔ تو اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے۔ ۳۱-۳۲

بھلا اس کو دیکھا جس نے اعراض کیا، تھوڑا سا دیا پھر رک گیا۔ کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے۔ کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسیٰ اور ابراہیم کے جس نے اپنے قول پورے کر دکھائے صحیفوں میں ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہوگی اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی، پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ سب کا

منتہیٰ تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ ۴۲-۴۳

اور بے شک وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے اور وہی ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد، نر اور ناری پیدا کیے ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکا دی جاتی ہے اور بے شک دوبارہ اٹھانا اس کی ذمہ داری ہے اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے۔ ۴۳-۴۹

اور اسی نے ہلاک کیا عادِ اوّل کو اور ثمود کو بھی، پس کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور قومِ نوح کو بھی ان سے پہلے۔ بے شک وہ نہایت ظالم اور سرکش تھے اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی دے مارا، پس اُن کو ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کے باب میں جھگڑتے رہو گے۔ ۵۰-۵۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۳۱)

خدا کی بادشاہی میں کسی کی حصہ داری نہیں

اوپر کی آیات میں شرک و شفاعت کی جو تردید فرمائی ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کسی اور کی حصہ داری ان کے اندر نہیں ہے کہ وہ خدا کے اقتدار کو چیلنج کر سکے یا اس کی مشیت میں کوئی مداخلت کر سکے یا اس کے ارادوں اور فیصلوں پر کسی پہلو سے اثر انداز ہو سکے۔

'لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ ...... الاٰیۃ' یہ 'ل' بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ نتیجہ کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ جب تنہا وہی مالک و مختار ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء اور سفارشیوں کے اعتماد پر میٹھی نیند سو رہے ہیں وہ محض فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ عادل و حکیم ہے، وہ ان لوگوں کو ضرور سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور کوئی نہیں ہے جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔ اسی طرح لازماً وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے نیکی اور نیکوکاری کی زندگی گزاری ہوگی، نہایت

ہی اچھا صلہ عطا فرمائے گا اور اس صلہ کے حصول کے لیے انھیں کسی دوسرے کی سفارش کی مطلق ضرورت نہیں ہوگی۔

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بروں کے سامنے تو صرف ان کے برے اعمال کی حقیقت آئے گی، جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ بے کم و کاست ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوئی اضافہ نہیں کرے گا لیکن نیکوں کو صرف ان کی نیکیوں کا صلہ ہی نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے اس وجہ سے وہ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرے گا لیکن وہ صاحب جود و فضل بھی ہے اس وجہ سے اپنے نیک بندوں کو ان کے حق سے زیادہ بھی بخشے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۳۲)

انسان سے اللہ تعالیٰ کا اصل مطالبہ

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک وہ ہیں جو بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچنے والے ہیں۔ ان سے اگر کوئی برائی صادر ہوتی ہے تو اس کی نوعیت بس یہ ہوتی ہے کہ گویا چلتے چلتے کسی گندگی پر پاؤں پڑ گئے۔ وہ کبھی ٹھوکر کھا کر کسی گناہ میں مبتلا تو ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح کوئی صفائی پسند کسی گندگی پر اپنا بستر نہیں ڈال دیتا بلکہ جلد سے جلد اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح یہ بھی یہ نہیں کرتے کہ اس گناہ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں، جلد سے جلد توبہ و اصلاح کے ذریعے سے اس سے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

'المام' اور 'لمم' کے اصل معنی کسی جگہ ذرا دیر کے لیے اتر پڑنے کے ہیں۔ مجاہد اور ابن عباس سے 'لمم' کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے لیکن پھر اس سے کنارہ کش ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانا اس سے بعید نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اس سے ضرور ہے کہ اس کی حسِ ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اس کی زندگی کا اس طرح احاطہ نہ کرلے کہ اس کے لیے اس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے بلکہ جب بھی اس کا نفس اس کو ٹھوکر کھلائے وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلے۔ جو لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔

سورۂ نساء میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ

اللہ پر صرف ان کی توبہ کی قبولیت کی ذمہ داری ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کر بیٹھتے

مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۱۷-۱۸)

ہیں پھر جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرلیتا ہے۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو برائی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو وہ بولا کہ اب میں نے توبہ کی اور ان لوگوں کی بھی توبہ نہیں ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

'كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ' میں 'اثم' سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا تعلق غصبِ حقوق اور ظلم وتعدی سے ہے اور 'فاحشۃ' سے مراد کھلی ہوئی بے حیائیاں اور بدکاریاں ہیں۔ 'کبائر' سے بچنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صغائر پر کوئی گرفت نہیں ہے بلکہ اس میں حکمت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جو لوگ کبائر سے بچتے ہیں ان کی حسِ ایمانی اتنی قوی ہو جاتی ہے کہ وہ صغائر کے ارتکاب پر کبھی راضی نہیں ہوتے جو ہزاروں کی امانت ادا کرتا ہے وہ کسی کے دھیلے پیسے میں خیانت کر کے خائن کہلانے پر کس طرح راضی ہوگا!

ان لوگوں کو تنبیہ جو ایمان و عمل کے بغیر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں

یہ تنبیہ ہے ان لوگوں کو جو ہر قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں میں تو آلودہ تھے لیکن اپنے مزعومہ شرکاء کی شفاعت، اپنے آباء و اجداد کی بزرگی اور اپنے حسب و نسب کی برتری کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ یہ جھوٹے سہارے۔

پیچھے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ قریش اور اہل کتاب سب اسی قسم کے کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہے ہیں۔ قریش کو دیویوں دیوتاؤں کے سوا اپنے اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) اور پاسبانِ حرم ہونے پر بھی بڑا ناز تھا۔ ان کے اسی ناز پر ان کو 'اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ...' (التوبۃ ۹: ۱۹) والی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی کہ حاجیوں کو پانی پلا دینا اور خانہ کعبہ کی کچھ دیکھ بھال کر دینا نیکی ہے لیکن یہ وہ نیکی نہیں ہے جو ایمان و عمل صالح کی قائم مقام اور تمھارے دوسرے جرائم کے لیے پردہ پوش بن سکے۔ اسی طرح اہل کتاب کو یہ غرہ تھا کہ وہ برگزیدہ امت اور ابراہیم و اسحاق علیہما السلام جیسے بزرگ نبیوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے دوزخ کی آگ ان پر حرام ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر کسی کو ڈالا بھی گیا تو صرف چند دنوں کے لیے۔ ابدی عذاب ان کے لیے بہرحال نہیں ہے۔ یہ چیز صرف دوسری قوموں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کے اسی غرور پر سیدنا مسیحؑ نے ان کو سرزنش فرمائی کہ اولادِ ابراہیم (علیہ السلام) ہونے پر

ناز نہ کرو، میرا رب چاہے گا تو ان پتھروں سے ابراہیمؑ کے لیے اولاد پیدا کرے گا۔ انہی یہود کی پیروی ان کے بعد مسلمانوں نے کی اور اپنے کو امتِ مرحومہ قرار دے کر ایمان و عمل کی ساری ذمہ داریوں سے بری کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر کتنے خاندان ہیں جن میں پیدا ہو جانا ہی جنت کی ضمانت ہے۔ اور کتنے قبرستان ہیں جن میں دفن ہونا ہی ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ پیدا ہونے والے اور مرنے والے کے عقائد و اعمال کیا رہے ہیں!

'هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۗ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى'۔ اس ذہن کے سارے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے یہ تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ اور اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اس دور کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے جب اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا اور اس دور کو بھی جانتا ہے جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی صورت میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ پانی، کیچڑ اور مٹی سے وجود میں آنے والی مخلوق، اور پھر ذلیل پانی کی ایک بوند سے رحمِ مادر کے اندر پرورش پانے والی ہستی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بجائے خود اپنے وجود ہی کو بڑے سے بڑے مرتبہ کا مستحق سمجھ بیٹھے اور نیکی و تقویٰ کی راہ میں کسی جد و جہد کی ضرورت سے مستغنی ہو جائے۔ اس کا وجود، ہر شخص جانتا ہے کہ نہایت حقیر عنصر سے ہوا ہے اور اس کی ابتدائی پرورش رحمِ مادر کی تنگنائے میں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجرد وجود کی بنیاد پر تو اس کو کسی خاص شرف کے حاصل ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اس کو شرف حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور دین کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اس چیز سے سب سے زیادہ واقف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی اپنی میزان میں تول کر جس کو جس مرتبہ کا مستحق پائے گا اس پر سرفراز فرمائے گا۔ اس میزان کے فیصلہ سے پہلے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی عالی مقامی کی منادی کرتا پھرے۔ یہ مضمون سورۂ معارج کی آیات ۳۸-۳۹ میں بھی آئے گا، وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہوگی۔

وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کی برخود غلطی

اس آیت میں انسان کے وجود کا جس حقارت آمیز انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے اس پر بھی نگاہ رہے اور 'فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ' میں اس کے دعوائے پاکی و برتری پر جو طنز ہے وہ بھی پیشِ نظر رہے۔ پھر غور کیجیے اپنے ان صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود پر جو مدعی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے، جو بالآخر اپنے کل میں مل جائے گا اور اس طرح قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جائے گا۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے العیاذ باللہ اپنے ہی وجود کے ایک جزو کا اس حقارت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ مجرد وجود کی بنا پر کسی دعوائے برتری و پاکی کو قرآن نے اپنے

منہ میاں مٹھو بننے سے تعبیر فرمایا ہے لیکن صوفی حضرات ہنکارتے ہیں کہ 'سبحانی ما اعظم شانی' (میں پاک ہوں، ہر عیب سے پاک! کیا کہنے ہیں میری عظمت کے! میری شان بڑی عظیم ہے!!) کیا کوئی انسان جس کے اندر ایمان کی رمق بھی ہو اپنی ذات کے بارے میں یہ فرعونی دعویٰ کر سکتا ہے؟ لیکن صوفیوں نے، چونکہ قرآن و حدیث کی جگہ باطنیہ، روافض اور برہمنوں سے رہنمائی حاصل کی ہے اس وجہ سے، ان فتنوں کو اسلام میں لا گھسایا اور آج کتنے کم سواد ہیں جو ان فقروں کو دہراتے ہیں حالانکہ وہ ان کے معنی سے بالکل بے خبر ہیں۔

اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی ۙ وَ اَعۡطٰی قَلِیۡلًا وَّ اَکۡدٰی ۙ اَعِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡغَیۡبِ فَہُوَ یَرٰی (۳۳-۳۵)

مفت کی جنت کے خواب دیکھنے والوں کی تمثیل

یہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے کردار کو ممثل کر کے پیش کیا ہے جو اس کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے اور کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو بس چھدا اتارنے کے لیے لیکن اپنے لیے اس کے ہاں بڑے اونچے اونچے مرتبوں کے مدعی ہیں۔ فرمایا کہ کیا ان کے پاس علم غیب کی دوربین ہے کہ وہ اس کی مدد سے ان مراتب و مقامات کو دیکھ رہے ہیں جو ان کے لیے محفوظ ہیں۔

'اَلَّذِیۡ' سے ہمارے مفسرین نے عام طور پر قریش کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے ایک ساتھی کو جب اس کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس سے کہا کہ اگر تم آخرت کے ڈر سے اسلام لانا چاہتے ہو تو اس سے بے فکر رہو۔ اگر تم مجھے اتنی رقم دے دو تو آخرت کے خطرے سے تم کو بچانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ ولید نے اس کی اطمینان دہانی کے بعد اسلام لانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کو مطلوبہ رقم دینے کا وعدہ کر لیا لیکن بعد میں اس کو تھوڑی سی رقم دے کر باقی رقم دینے سے مکر گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ تمام مفسرین نے بیان کیا ہے لیکن اول تو روایت ہی کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق کسی پہلو سے بھی ان آیات کے سمجھ میں نہیں آیا۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ولید نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو کیا قرآن نے یہاں اس بات پر اس کو ملامت کی ہے کہ اس نے اپنا وعدہ کیوں نہیں پورا کیا!

اصل یہ ہے کہ 'اَلَّذِیۡ' چونکہ عام طور پر معرفہ کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ہمارے مفسرین جہاں کہیں 'اَلَّذِیۡ' یا 'اَلَّتِیۡ' دیکھ پاتے ہیں تو ان کو تلاش کسی خاص شخص کی ہوتی ہے جس پر اس کو منطبق کر سکیں۔ اس کوشش میں انھیں لازماً کوئی نہ کوئی واقعہ بھی بنانا پڑتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بے تکا اور کلام کے موقع و محل سے کتنا ہی بے جوڑ ہو۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں کہ 'اَلَّذِیۡ' یا 'اَلَّتِیۡ' ہر جگہ کسی خاص مرد یا کسی

معیّن عورت ہی کے لیے نہیں آتے بلکہ بعض مواقع میں تمثیل کے لیے بھی آتے ہیں یعنی مقصود تو کسی گروہ یا جماعت کے مجموعی کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا لوگوں کے سامنے اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیا گیا۔ ہم پچھلی مثالوں میں سے یہاں ایک مثال کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں یہود کو تنبیہ فرمائی گئی ہے: 'وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا' کہ اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سارا کاتا تنا، اچھی طرح محکم کرنے کے بعد، ادھیڑ کے رکھ دیا۔ یہاں دیکھ لیجیے 'الَّتِي' آیا ہے لیکن اس سے کوئی معیّن بڑھیا مراد نہیں ہے کہ اس کے نام، خاندان، محلہ کا سراغ لگایا جائے اور اس بات کی تحقیق کی جائے کہ وہ کس طرح کاتتی اور کیوں اپنے کاتے ہوئے کو ادھیڑتی تھی۔ یہ ساری کاوشیں غیر ضروری ہیں اس لیے کہ یہاں اشارہ کسی معیّن بڑھیا کی طرف نہیں بلکہ ایک تمثیلی کردار کی طرف ہے۔

اسی طرح یہاں ان مشرکین کے سامنے جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے فرضی معبودوں کی شفاعت اور اپنے خاندانی شرف کے زعم میں مدّعی تھے کہ جس طرح دنیا میں وہ عالی مقام ہیں اسی طرح آخرت میں بھی، اگر وہ ہوئی، ان کے لیے مراتبِ عالیہ ہیں، ایک کردارِ تمثیل کی صورت میں رکھا گیا ہے جس کے آئینہ میں ولید بن مغیرہ بھی اپنی شکل دیکھ سکتا تھا، ابولہب بھی دیکھ سکتا تھا اور قریش کے وہ سارے اغنیاء و بخلاء بھی دیکھ سکتے تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ انفاق سن کر تو منہ پھیر لیتے لیکن مدّعی تھے کہ جنت کی کنجیاں ان کے قبضہ میں ہیں۔

اسلوبِ کلام یہاں طنز و تحقیر کا ہے۔ یعنی ذرا ان بوالفضولوں کو تو دیکھو جو خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرنے سے تو جی چراتے ہیں، شرما شرمی میں کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو محض چھپّا اتارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مدّعی اپنے لیے اونچے اونچے درجوں کے ہیں، گویا ان کے لیے جنت میں جو سامانِ عیش مہیا ہے اس کو غیب کی عینک سے یہیں سے بیٹھے بٹھائے دیکھ رہے ہیں۔

بخیلوں کی عام روش

'اَكْدٰى'۔ 'اكدى الحافر' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'اكدى الحافر' کا مفہوم یہ ہے کہ کھودنے والے کے آگے کھدائی کے وقت کوئی ایسی چٹان آ گئی جس کو توڑنا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ یہ بخیلوں کی عام روش بیان ہوئی ہے کہ اگر مارے باندھے کبھی کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو تھوڑا سا خرچ کرتے ہی ان پر بخل کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ ان کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں اور اگر کوئی ان کو اکساتے کی کوشش کرے تو وہ اس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں کہ کہاں تک خرچ کیے جاؤں، چلو ہٹو، میں تو ڈھیروں مال لٹا چکا ہوں۔ 'يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا' (البلد: ۶) والی آیت میں انہی بخیلوں کی تصویر ہے۔

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۳۶-۳۸)

قریش اور اہل کتاب دونوں کو ایک تنبیہ

یعنی یہ لوگ مفت میں، محض اپنے بزرگوں اور فرضی دیوتاؤں کی سفارش کے بل پر جنت کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ کیا موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں کی یہ تعلیم ان کو نہیں پہنچی کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں مخاطب اصلاً قریش اور ضمناً اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ، دونوں نبیوں کی پیروی کے مدعی تھے۔ اسی طرح قریش حضرت ابراہیمؑ کو اپنا خاندانی بزرگ بھی مانتے تھے اور دینی پیشوا بھی، اس وجہ سے ان دونوں جلیل القدر نبیوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر یہاں 'اَلَّذِیْ وَفّٰی' کی صفت کے ساتھ ہوا ہے۔ یعنی وہ جس نے اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل کا حق ادا کر دیا، جس نے ہر عہد پورا کیا اور جو ہر امتحان میں صادق الوعد اور کامل العیار ثابت ہوا۔ دوسرے مقام میں ارشاد ہوا ہے: 'وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ' (البقرۃ: ۱۲۴) (یاد کرو، جب کہ ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ سب پوری کر دکھائیں)۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس صفت کی یاد دہانی میں قریش اور اہل کتاب دونوں کو تنبیہ ہے کہ ان کو دنیا اور آخرت میں جو رتبۂ بلند ملا وہ اپنے رب کے ساتھ کامل وفاداری کے صلہ میں ملا اور تمھارا حال یہ ہے کہ کرنے کرانے کے تو کچھ نہیں لیکن ابراہیمؑ کے نام پر استخوان فروشی کی ایک دکان کھول رکھی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صُحُف' کی اضافت حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی فرمائی ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ کا بھی کوئی صحیفہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصطلاحی مفہوم میں تو حضرت ابراہیمؑ کا کوئی صحیفہ نہیں تھا۔ ان کی تعلیمات زبانی تھیں جو بطریق روایت ان کی ذریت کی دونوں شاخوں میں نقل ہوتی رہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ تعلیمات زیادہ روشن رہیں اس لیے کہ ان کے اندر برابر انبیاء آتے رہے۔ بنی اسمٰعیل امی تھے، اس وجہ سے ان کے اندر یہ دھندلی ہوتی چلی گئیں۔ بعد میں جب تورات مرتب ہوئی تو اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ اور ان کی تعلیمات بھی جمع کر دی گئیں۔ ان میں یہود نے اگرچہ اپنے اغراض کے تحت بہت سی تحریف کر ڈالی جس کی طرف پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم اشارے کر چکے ہیں لیکن آپ کی بنیادی تعلیمات، خاص طور پر وہ جن کا یہاں حوالہ ہے، اس میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے اگر صحفِ ابراہیم سے وہ صحیفے مراد لیے جائیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات مذکور ہیں تو یہ نسبت بالکل صحیح ہو گی۔

ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں کی بنیادی تعلیم

'اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی' یہ اس تعلیم کا حوالہ ہے جو موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں موجود ہے کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ یہ اسی شفاعتِ باطل کے تصور کی تردید ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے۔ یہ تعلیم تورات اور انجیل دونوں میں اتنی کثرت سے بیان ہوئی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی واضح بدایات

کے باوجود ان کتابوں کے حاملین کو شیطان نے کس طرح شرک کے کھڈ میں گرا دیا۔ ہم ان کے حوالے اس کتاب میں جگہ جگہ نقل کرتے آرہے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۠ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (۳۹-۴۱)

یہ اسی اوپر والی بات کی شرح مزید ہے کہ یہ حقیقت بھی اس کے ساتھ واضح کر دی گئی تھی کہ ہر انسان خدا کے ہاں صرف اپنی ہی محنت کا حاصل پائے گا، یہ نہیں ہوگا کہ نیکی تو کسی نے کی اور اس کا پھل کوئی اور کھائے، یا بدی تو زید نے کی اور اس کی سزا بکر بھگتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے آباؤ اجداد بڑے نیک تھے تو ان کی نیکی کا صلہ انہی کو ملے گا، یہ نہیں ہوگا کہ ان کے اعمال کے صلہ میں تم جنت میں جا براجو۔ یہی اصول دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان ہوا ہے: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ (البقرۃ: ۱۳۴) (یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا ہے اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم کماؤ گے)۔ اگر نیک باپ کے اعمال کے صلہ میں اس کی اولاد جنت میں جا سکتی تو حضرت نوحؑ سے زیادہ نیک کون ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے باوجود ان کے بیٹے کو نہیں بخشا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ جیسے خلیل اللہ نے اپنے باپ کے لیے دعا فرمائی لیکن وہ بھی قبول نہیں ہوئی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا بے لاگ ہے کہ ایک پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے کچھ کام نہ آیا۔ اس کے برعکس فرعون کی بیوی اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے دشمن کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۃ تحریم میں نہایت شاندار الفاظ میں اس کی تعریف فرمائی۔ باپ بیٹے اور میاں بیوی کے رشتے سب سے زیادہ محبوب رشتے ہیں اور پیغمبروں سے زیادہ خدا کا کوئی مقرب نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ جن کے پاس اپنی نیکی کا توشہ موجود نہیں تھا وہ ان رشتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے تو تا بدیگراں چہ رسد!

دوسرے کی نیکی کے کام آنے کی صورتیں

آدمی کو دوسرے کی نیکی سے خدا کے ہاں کوئی فائدہ دو صورتوں میں پہنچنے کی توقع ہے۔ ایک یہ کہ یہ نیکی ایمان کے رشتۂ محبت پر مبنی ہو۔ مثلاً ایک مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کے لیے دعا کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے۔ دوسری یہ کہ آدمی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس نیکی میں کوئی دخل ہو، مثلاً یہ کہ اس نے اس کی تعلیم دی ہو یا اپنے عملی نمونہ سے اس کی مثال قائم کی ہو یا اس کے وسائل مہیا کرنے میں کسی نوع سے اس کا حصہ رہا ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی دخل اس نیکی میں اس کا ہے تو یہ بھی درحقیقت ایک طرح سے اس کی سعی و کسب ہی میں داخل اور اس کے لیے یہ ایک خیر جاری ہے۔

اشتراکی ذہن کے لوگوں کا ایک بے بنیاد استدلال

بعض اشتراکی ذہن کے لوگ اس آیت سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کے بقدر ہی ملنا چاہیے، لیکن یہ آیت جس موقع و محل میں ہے اس سے یہ استنباط اپنی ذہانت کا بالکل بے جا استعمال ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ہم ایک غیر متعلق مسئلہ سے تعرض نہیں کرنا

چاہتے۔ البتہ نفسِ اختراکیت کے بنیادی فلسفہ پر اس کے محل میں ہم نے بحث کی ہے اور آگے بھی موزوں مقامات پر اس کے بعض پہلوؤں پر ان شاء اللہ ہم روشنی ڈالیں گے۔ بس اتنی بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اس دنیا کا نظام امتحان و آزمائش کے اصول پر مبنی ہے اور آخرت میں معاملات عدل و انعام کے اصول پر طے ہوں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے حق المحنت کے طور پر کوئی چیز نہیں دی ہے بلکہ کسی کو کم دیا کسی کو زیادہ اور اس طرح دونوں کے صبر و شکر کا امتحان کیا ہے۔ آخرت میں ان لوگوں کو ان کی نیکی کا صلہ ملے گا جو اس امتحان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ محروم رہیں گے جو امتحان میں ناکام رہے۔ ان کی یہی ناکامی ان کو جہنم میں لے جائے گی، اس لیے کہ اس طرح کے ناکاموں کا ٹھکانا آخرت میں جہنم ہی ہے۔

وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ﴿﴾ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ۔ یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ یہ کوئی ہوائی بات ہے بلکہ ہر شخص نے جو کچھ کمائی کی ہوگی وہ جلد اللہ تعالیٰ کے ملاحظے میں آئے گی اور پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ اہلِ ایمان کے لیے تسلی اور منکرینِ جزا و سزا کے لیے تنبیہ ہے کہ اہلِ ایمان مطمئن رہیں کہ ان کی رائی کے دانے کے برابر نیکی بھی رائگاں نہیں جائے گی اور منکرین بھی آگاہ رہیں کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی نظر انداز نہیں کی جائے گی۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۴۲)

سب کا مرجع صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوگا

اور یہ بات بھی واضح رہے کہ سب کی بازگشت تیرے رب ہی کی طرف ہوگی۔ اس مغالطے میں کوئی نہ رہے کہ تیرے رب کے سوا کسی کا مولیٰ و مرجع کوئی اور بھی ہے جو اس کو خدا کی بازپرس سے بچالے گا، یا خدا کے فیصلوں کے خلاف وہ کوئی مرافعہ اس کی عدالت میں کر سکے گا۔ خدا ہی کے حضور میں سب کی پیشی بھی ہوگی اور خدا کے فیصلے بالکل آخری اور حتمی بھی ہوں گے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی ﴿﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا ﴿﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ﴿﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی ﴿﴾ وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی (۴۳-۴۷)

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں سب کا مولیٰ و مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جس کے اختیار میں ہنسانا بھی ہے اور رلانا بھی۔ یعنی وہی خوشی کے اسباب بھی پیدا کرتا ہے اور وہی غم کے اسباب سے بھی دوچار کرتا ہے۔ اسی کے اختیار میں سُکھ بھی ہے اور اسی کے اختیار میں دُکھ بھی۔ رنج و غم اور نفع و ضرر سب اسی کے اختیار میں ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا کس حق کی بنا پر مولیٰ و مرجع بن جائے گا؟

اسی طرح وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔ تو جب کسی دوسرے کو نہ موت کے معاملے میں کوئی دخل نہ زندگی کے معاملے میں کوئی اختیار تو اس کے سوا کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے کے کیا معنی؟

اسی نے جوڑے کے دونوں فرد ——— مرد اور عورت ——— پیدا کیے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ

مرد کو تو کسی نے پیدا کیا ہو اور عورت کہیں اور سے وجود میں آئی ہو، بیٹے کوئی بخشتا ہو اور بیٹیاں کہیں اور سے آدھمکتی ہوں۔ تو جب اس طرح کی کسی تقسیم کا امکان عورت اور مرد کی پیدائش میں نہیں ہے تو کسی اور کے مرجع بنانے کے کیا معنی؟

ان کی پیدائش پانی کی ایک بوند سے ہوتی ہے جو ٹپکا دی جاتی ہے۔ اس ٹپکا دینے کے بعد کسی کو بھی پتہ نہیں کہ اس کی نشوونما کس شکل میں ہوگی۔ اس سے لڑکی پیدا ہوگی یا لڑکا، اس کی تکمیل ہوگی یا یہ ناتمام ہی رہے گا؟ اس کو شکل و صورت کیسی ملے گی؟ ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں صرف وہ خلاق و علیم ہی جانتا ہے جو گوناگوں پردوں کے اندر پانی کی اس بوند کی پرورش کرتا اور ایک معین مدت کے بعد اس کو ظہور میں لاتا اور پھر اس کو ایک مرد یا عورت کی حیثیت سے پروان چڑھاتا ہے۔ جب یہ سارے کام خدا ہی کے اختیار میں ہیں تو اولاد کے لیے درخواست کسی اور سے کیوں کی جائے؟

وَاَنَّ عَلَیْہِ النَّشْاَۃَ الْاُخْرٰی۔ یعنی جب خدا ہی سب کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیوں دشوار ہو جائے گا؟ اس کا ممکن ہونا بھی واضح ہے اور خدا کے عدل اور اس کی رحمت کے ظہور کے لیے اس کی ضرورت بھی واضح ہے۔ تو جب یہ دونوں باتیں واضح ہیں تو اللہ تعالیٰ کی حکمت واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے جس میں سب کو اٹھا کھڑا کرے۔ ان کی نیکی اور بدی کو جانچے اور ان کے اعمال کے اعتبار سے ان کو جزا و سزا دے۔

یہ ساری باتیں معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلانِ براءت میں بھی موجود ہیں جو انھوں نے اپنی قوم سے علیحدگی کے وقت کیا ہے۔ سورۂ شعراء میں یہ یوں نقل ہوا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ	جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہ میری رہنمائی فرماتا ہے
ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ	اور وہ کہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب
فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ	میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔ جو
یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ	مجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا اور وہ کہ
خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝	جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن
(الشعراء: ۷۸-۸۲)	میری خطائیں بخشے گا۔

وَاَنَّہٗ ھُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ۝ وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (۴۸-۴۹)

بخیل المالدار — یعنی وہی ہے جو آدمی کے فقر کو غنا سے بدل دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس کی ضرورت سے اتنا زیادہ دے دیتا ہے کہ وہ اس کو جمع کر کے مال دار آدمی بن جاتا ہے۔ 'اَقْنٰی' 'قنیۃ' سے ہے جو جمع کیے ہوئے مال کے لیے آتا ہے۔ گویا 'اَغْنٰی' یہاں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو فقر کے دائرہ سے نکل چکے — کو تنبیہ

ہیں اور 'اَقْنٰی' ان کے لیے استعمال ہوا ہے جو صرف فقر کے دائرہ سے نکل ہی نہیں چکے ہیں بلکہ مال داروں کے زمرے میں ہیں۔ اوپر آیات ۳۳-۳۴ میں ان مال داروں کا کردار بیان ہو چکا ہے جو خدا کی راہ میں دیتے دلاتے تو کچھ بھی نہیں لیکن جنت کے مراتب عالیہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ انہی کو تنبیہ ہے کہ جو مال و ثروت ان کو حاصل ہے یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں شِعْریٰ کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے۔ 'شِعْریٰ' کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

شعریٰ — 'شِعْریٰ' ایک ستارے کا نام ہے جو موسمِ بہار میں طلوع ہوتا ہے۔ مشرکینِ عرب اس کو بہت مبارک سمجھتے تھے اور بہار کی تمام شادابیاں اور تمام تجارتی سرگرمیاں اسی سے منسوب کرتے تھے۔ ایک جاہلی شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :

شامس فی القرحتی اذا ما ذکت الشعری فبرد و ظل

(وہ سردیوں کی ٹھنڈ میں لوگوں کو گرمی پہنچانے والا ہے اور جب شِعْریٰ طلوع ہوتا ہے (یعنی موسمِ بہار میں) تو وہ لوگوں کے لیے ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے)

یہاں اس بحث پر نظر رہے جو ابتدائے سورہ میں 'وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی' کے تحت گزر چکی ہے کہ یہ ستارے جن کو ناداوں نے اپنی قسمتوں کا مالک سمجھ رکھا ہے، اپنے سجود و ہبوط سے خود شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا رب ہے۔

یہ امر ضروری نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں بعینہٖ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں کے حوالوں ہی پر مبنی ہوں بلکہ ان کی نوعیت توسیعِ کلام کی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک قول کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایسے اضافے بھی کر دیے جاتے ہیں جو اگرچہ لفظاً تو اس قول کا جزو نہیں ہوتے لیکن معناً اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس سے بات کی پوری وضاحت بھی ہو جاتی ہے اور کلام مطابقِ حال بھی ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہی صورت یہاں بھی ہے۔ آیت ۴۲ سے آگے کی آیات توسیعِ کلام کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے کلام قریش کے لیے گویا خود ان کی حکایت بن گیا ہے۔

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰی ۝ وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰی ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی (۵۰-۵۲)

قریش کو تنبیہ تاریخ کے حوالہ سے — یہ بھی توسیعِ کلام ہی ہے۔ تاریخی حوالوں سے قریش کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جس طرح آج تمھیں انذار کیا جا رہا ہے اسی طرح تم سے پہلے اس ملک کی قوموں میں سے عاد اور ثمود کو بھی ان کے رسولوں نے انذار کیا اور ان سے پہلے قومِ نوح کو بھی، لیکن ان قوموں نے خدا کے انذار کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا اور اس طرح ہلاک کیا کہ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی انجام تمہارا بھی ہونا ہے اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور تمھاری اپنی تاریخ

اس کی گواہ ہے۔

عاد کو یہاں عادِ اولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثمود انہی کے بقایا میں سے تھے اور وہ عادِ ثانی سے مشہور تھے۔

'اِنَّھُمۡ کَانُوۡا ھُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰی' کا تعلق صرف قومِ نوح ہی سے نہیں ہے بلکہ عاد اور ثمود سے بھی ہے۔ یعنی ان سب پر جو تباہی آئی یہ قدرت نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور نہایت سرکش تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں پر جو تباہی آتی ہے اس کے اصل اسباب خارج میں نہیں ہوتے بلکہ وہ ان قوموں کے اندر ہی سے ابھرتے ہیں جو کبھی زلزلہ، سیلاب اور طوفان کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں کبھی کسی دشمن کے حملہ و ہجوم کی صورت میں۔

وَالۡمُؤۡتَفِکَۃَ اَھۡوٰی ۙ فَغَشّٰھَا مَا غَشّٰی (۵۳-۵۴)

یہ قومِ لوط کی طرف اشارہ ہے۔ 'مُؤۡتَفِکَۃ' کی تحقیق لسان العرب میں یہ بیان ہوئی ہے[1]۔

"مُؤۡتفکات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو زمین کو بالکل تلپٹ کر دیتی ہیں جس طرح جوتنے والا کھیت کی زمین کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے اور وہ زمین پر مٹی اور ریت کی تہ جما دیتا ہے تو اس کو بھی 'مُؤۡتَفِکَۃ' کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو تند طوفانی ہوا زمین کو ریت اور کنکر سے ڈھانک دیتی ہے وہ بھی 'مُؤۡتفکۃ' ہے۔"

قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو تند ہو کر بالآخر 'حاصب' یعنی کنکر پتھر برسانے والی طوفانی ہوا بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'فَمِنۡھُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِ حَاصِبًا' (العنکبوت۔۲۹:۴۰) (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسا دینے والی آندھی بھیجی)، نیز فرمایا ہے 'جَعَلۡنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡھِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ' (الحجر۔ ۱۵: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر سنگِ گل کی بارش کی)۔

'فَغَشّٰھَا مَا غَشّٰی'۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسی صورتِ حال کی تعبیر کے لیے آتا ہے جس کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہوں۔ یعنی ان کو ایسی چیز نے ڈھانک دیا جو الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی (۵۵)

قریش کو متنبہ کیا کہ حیثیتِ جماعت ملامت

یہ خطاب قریش سے ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن مخاطب پوری جماعت ہے۔ جب جماعت کو واحد

---

[1] لسان العرب، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱

کے صیغہ یا ضمیر سے خطاب کرتے ہیں تو مقصود جماعت کے ایک ایک فرد کو متنبہ کرنا ہوتا ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ منکرین کو فرداً فرداً خطاب کر کے ملامت فرمائی ہے کہ جزاء و سزا کے یہ سارے دلائل جو عقل سے، نقل سے، موسیٰ و ابراہیمؑ کے صحیفوں اور قوموں کی تاریخ سے بیان ہوئے ہیں، تمھارے سامنے ہیں تو بتاؤ اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے اور ان کے باب میں جھگڑتے رہو گے۔

'آلاء'، 'اِلیٰ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہمارے مفسرین و مترجمین نے عام طور پر نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا مفہوم ہے۔ اس کے اصل معنی کرشمے، نشانیاں، عجائبِ قدرت، کارنامے، نوادر اور آثارِ حکمت کے ہیں۔ نعمتیں بھی چونکہ انہی کے تحت ہیں اس وجہ سے وہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ہر جگہ اس کا ترجمہ نعمت صحیح نہیں ہے اس لیے کہ نعمت کی طرح اللہ تعالیٰ کی نقمت کی نشانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ لفظ سورۂ رحمان میں بار بار آیا ہے اور اس کے سارے پہلو اس میں واضح ہو گئے ہیں۔ وہاں ہم اس کی وضاحت اس کے مواقع استعمال اور کلامِ عرب کی روشنی میں کریں گے۔ استاذ امام حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔

۶- آگے آیات ۵۶ - ۶۲ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں قرآن کے معروف طریقہ کے مطابق اس مضمون کی پھر یاددہانی فرما دی گئی ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ یاد ہو گا کہ سورہ کا آغاز اس مضمون سے ہوا ہے کہ اس قرآن کو کاہنوں اور نجومیوں کے کلام کی قسم کی کوئی چیز خیال کر کے اس کے انذار کو ٹالنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ یہ وحی الٰہی اور کلام ربانی ہے۔ اگلے زمانوں میں جس طرح نذیر آچکے ہیں انھی کے زمرے کا نذیر یہ بھی ہے۔ یہ جس چیز سے تمھیں ڈرا رہا ہے اس کو دور نہ سمجھو، وہ آئی کھڑی ہے اور جب آجائے گی تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں بنے گا۔ اس کلام کا مذاق نہ اڑاؤ۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں، رونے کی چیز ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۶ - ۶۲

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ ﴿٥٦﴾ أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ﴿٦٠﴾ وَأَنتُمْ سَامِدُونَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴿٦٢﴾ ۩

ترجمۂ آیات ۵۶ - ۶۲

یہ اگلے نذیروں ہی کے زمرے کا ایک نذیر ہے۔ قریب آنے والی قریب آگئی ہے

اللہ کے سوا اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہو سکتا۔ تو کیا تم اس کلام پر متعجب ہوتے ہو! اور ہنستے ہو، روتے نہیں! اور تم مدہوش پڑے ہو! (ہوش میں آؤ!) اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ ۵۶-۶۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (۵۶)

ابتداء کے مضمون کی طرف اشارہ

'ھٰذا' سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ چونکہ بحث کا آغاز قرآن ہی سے ہوا تھا اس وجہ سے مشارٌ الیہ کے ذکر کے بغیر بے تکلف آخر میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جس سے تمہید اور خاتمہ کا ربط بالکل واضح ہو گیا۔ اگر کوئی اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لے تو بھی کوئی فرق واقع نہیں ہو گا اس لیے کہ پیغمبر اور اس کی دعوت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید میں بعض جگہ 'ذِكْرًا رَّسُوْلًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ 'ذکر' سے مراد قرآن ہے اور 'رسول' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا گیا ہے کہ نبی اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

'نُذُرٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ 'نذیر' کی جمع ہے۔ اس سے مراد پچھلے انبیاء اور پچھلے صحائف سب ہیں اور مقصودِ کلام تنبیہ ہے کہ اس کلام کو ہنسی مسخری کی چیز نہ سمجھو۔ یہ اسی طرح کا انذار ہے جس طرح کا انذار پچھلی قوموں کو کیا گیا۔ اگر تم نے اس کا مذاق اڑایا تو یاد رکھو کہ اس کا انجام تمہارے آگے بھی اسی شکل میں آئے گا جس شکل میں پچھلی قوموں کے سامنے آ چکا ہے۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۷-۵۸)

ایک حقیقت نفس الامری کا بیان

'اٰزِفَةٌ' کے معنی ہیں قریب آنے والی۔ مراد اس سے عذاب کی وہ گھڑی ہے جس سے قرآن لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے اس کو بہت دور نہ سمجھو۔ اب وہ تمہارے سروں پر منڈلا ہی رہا ہے۔

ہم اس سنتِ الٰہی کی طرف بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی قوم کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول آ جاتا ہے تو پھر اس کو اتنی ہی مہلت ملتی ہے جتنی اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس مہلت کے گزرتے ہی وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے اگر رسول کی تکذیب پر وہ اڑی جاتی ہے۔ یہ عذاب اس قوم کے لیے قیامت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اسلوب بیان رسول کی زبان سے ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان ہوتا ہے، اس میں ذرا بھی مبالغہ کا شائبہ نہیں ہوتا۔

"لَیْسَ لَہَا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَاشِفَۃٌ" یعنی اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ یہ گھڑی آئی تو تمہاری دیویاں —— لات، منات اور عزّیٰ —— اور تمہارے دوسرے دیوی دیوتا تمہارے کچھ کام آنے والے بنیں گے اور اس کی پکڑ سے تمھیں بچالیں گے۔ یاد رکھو کہ اللہ کے سوا اس کو دُور کرنے والا کوئی بھی نہیں بن سکے گا۔

اَفَمِنْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ ہ وَتَضْحَکُوْنَ وَلَا تَبْکُوْنَ (۵۹-۶۰)

ان کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ جو کتاب تمھیں اتنے بڑے عذاب کے قرب کی خبر دے رہی ہے تم اس کے انذار پر تعجب کر رہے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کدھر سے اور کیوں آجائے گا! آگاہ ہو جاؤ کہ یہ چیز ہنسنے اور مذاق اڑانے کی نہیں بلکہ رونے اور سر پیٹنے کی ہے لیکن تم رونے کی جگہ اس پر ہنس رہے ہو!

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱)

'سمد' اور 'سمود' کے معنی مدہوش ہونے کے ہیں۔ یعنی یہ کتاب تو تمھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے لیکن تم غفلت کے بستروں پر پڑے سو رہے ہو۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا (۶۲)

یعنی خیریت چاہتے ہو تو جاگو اور دوسرے دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر اپنے رب ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی اور اس آفت سے نجات دینے والا نہیں بنے گا۔

اس سورہ کا آغاز ستاروں کے ہبوط و سجود سے ہوا تھا اور اس کا اختتام اللہ ہی کے لیے سجدہ اور اس کی عبادت کی دعوت پر ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

رحمان آباد
۲۲۔ جولائی ۱۹۷۷ء
۶۔ شعبان ۱۳۹۷ھ